JIHĀT-UL-ISLĀM
Vol: 14, Issue: 01, July – December 2020

OPEN ACCESS
JIHĀT-UL-ISLĀM
pISSN: 1998-4472
eISSN: 2521-425X
www.jihat-ul-islam.com.pk

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کا نظریہ نسخ اور احادیث کی تعبیر و تشریح میں اس کا اثر

The concept of abrogation of Moulana Anwar Shah Kashmiri and its impact on the interpretations of Hadith

Hafiz Muhammad Rasheed*
Ph.D. Scholar, Sheikh Zayd Islamic Centre, University of the Punjab. Lahore.

Dr. Muhammad Ijaz**
Director, Sheikh Zayd Islamic Centre, University of the Punjab. Lahore.

Abstract

Molana Anwar Shah Kashmiri was a reputed Muhaddith of sub-continent. Wide vision of study and strong memory were his unique qualities. His worthy students wrote his lectures and transferred them in the shapes of worthy books. His unique technique of the interpretation of Hadith can easily understand through these books. In this article, we will try to understand the concept of abrogation of Molana Anwar Shah Kashmiri. There is a variety of opinions of abrogation among scholars, that's why the fluctuation have been occurred in the number of abrogated verses. Molana Anwar Shah has a stand on this issue that no verse is abrogated completely. It is possible that a verse can be abrogated for its some particles but it is still relevant it's some particles. He applied this approach on the interpretation of Hadith. In this article, a research study is being conducted on Molana's concept of abrogation and its effects on the interpretation of Hadith.

Key words: *Abrogation, Molana Anwar shah Kashmiri, interpretations, Hadith*

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو احکامات عطا فرمائے ان میں تدریج اور حالات کی مناسبت کا خیال رکھا، جیسے ایک ماہر طبیب کسی مریض کے مرض کا علاج کرتے ہوئے اس کے حالات کے مطابق دوائی میں رد و بدل کرتا ہے بالکل ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے احکامات کے نزول میں انسانی طبائع، حالات و واقعات اور زمینی حالات کا خیال رکھا ہے، اسی لیے قرآن کریم میں کچھ امور سے متعلق احکامات نازل کیے گئے اور بعد میں ان کو منسوخ کرکے متبادل احکامات کا نزول ہوا۔ اس عمل کو فقہ کی اصطلاح میں نسخ (Abrogation) کی اصلاح سے ذکر کیا جاتا ہے۔ احکام شرع میں نسخ ایک حقیقت ہے، لیکن نسخ کی تعریف و تعبیر میں متقدمین و متاخرین اہل علم کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، متقدمین کے ہاں نسخ کی تعریف و تعبیر کی وجہ سے منسوخ آیات کی تعداد کافی زیادہ ہے، متاخرین خصوصا شاہ ولی اللہؒ

CC BY

(1703ء تا 1762ء) کے ہاں نسخ کی تعریف کی وجہ سے منسوخ آیات کی تعداد کافی کم رہ جاتی ہے[1]۔ بعد کے ادوار میں نسخ کی تعریف میں اہل علم کے مابین مزید تبدیلی ہوئی اور جدید مفکرین کے ہاں احکام قرآنی میں نسخ تو ایک حقیقت ہے لیکن موجودہ قرآن کی آیات میں سے کوئی بھی آیت منسوخ نہیں، بلکہ ان کا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی محل موجود ہے۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اسی نظریہ نسخ کے نمائندہ ہیں۔ ان کے ہاں قرآن کریم کی وہ آیات جن کو عام طور پر منسوخ آیات میں شمار کیا جاتا ہے، وہ بھی بالکلیہ منسوخ نہیں ہیں، بلکہ وہ احادیث کی تعبیر و تشریح میں بھی ناگزیر مواقع پر ہی نسخ کے قائل ہیں، وگرنہ جن احادیث کے بارے میں عام طور پر اہل کا موقف نسخ کا ہوتا ہے وہ وہاں بھی ان کی ایسی تعبیر و تشریح کرتے ہیں کہ یہ احادیث بھی بالکلیہ منسوخ نہیں کہی جا سکتیں، اسی وجہ سے ان کے نظریہ نسخ کا مطالعہ کافی اہم اور مفید ہے۔ ہم ذیل کی سطور میں ان کے اسی نظریہ نسخ کا اصولی و اطلاقی مطالعہ کریں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ وہ ان حادیث کی تعبیر و تشریح میں کیا اسلوب اختیار کرتے ہیں کہ جن احادیث کو عام شارحین حدیث نے منسوخ احادیث میں شمار کیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے امام طحاوی ؒ (م321ھ و933ء) کے ہاں نسخ کی ایک منفرد تعبیر کی طرف بھی اشارات کیے ہیں جن سے امام طحاویؒ کے ہاں جب نسخ بولا جاتا ہے تو اس سے کیا مراد ہوتا ہے، اس پر روشنی پڑتی ہے۔

احکام میں نسخ کی حقیقت اور نوعیت

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ 1.1

نہیں ہم منسوخ کرتے کوئی آیت یا اسے بھلا دیتے ہیں، مگر لاتے ہیں اس سے بہتر آیت یا اس جیسی، کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ آیت احکام شریعت میں نسخ کی موجودگی کی دلیل ہے۔ نسخ کی تعبیر میں متقدمین و متاخرین کے ہاں اختلاف رہا ہے جس کی وجہ سے منسوخ آیات کی تعداد میں بھی کمی زیادتی ہوتی رہی۔ شاہ صاحبؒ اس اختلاف کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

ومما ينبغي ان يعلم ان النسخ عند السلف اطلق علي تقييد المطلق ، و تخصيصي العام ، و تاويل الظاهر ايضا ، نص عليه ابن تيمية و ابن حزم رحمهما الله تعالي، وهو عند المتاخرين عبارة عن رفع حكم شرعي- و وسع فيه الطحاوي بطريق ثالث ، فاطلقه علي ظهور امر بخلاف ما كان عند الصحابة رضي الله عنهم ايضا، كما فعل في مسالة الابراد ، فكان عندهم التعجيل فاذا ابرد النبي صلي الله عليه و سلم فقد ظهر بخلاف ما كان عندهم ، فاطلق فيه النسخ ، و هكذا فعل في رفع اليدين و غير واحد من المواضع ، و لذا كثر في كلام السلف اطلاق النسخ - [2]

امام طحاویؒ کے ہاں نسخ

مذکورہ بالا عبارت میں شاہ صاحبؒ نے امام طحاویؒ کے ہاں نسخ کی تعبیر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ متقدمین و متاخرین سے ہٹ کر ایک اور تعبیر کو بھی نسخ کہتے ہیں۔ اس اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ امام طحاویؒ حکم میں کسی بھی قسم کی تبدیلی ہو اسے نسخ سے ہی تعبیر کرتے

ہیں، خواہ اس تبدیلی سے حکم مرتفع ہو یا نہ ہو، اس لیے انہوں نے متعدد مقامات پر ایسے احکامات پر بھی نسخ کا اطلاق کیا ہے جو استحباب کے درجے میں ثابت ہیں اور یہی اصطلاح کچھ محدثین نے بھی اختیار کی ہے۔ مثلاً امام ابو داودؒ نے مغرب کی نماز میں لمبی قراءت کو منسوخ قرار دیا ہے، حالانکہ مرض الموت میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو مغرب کی نماز پڑھائی تھی اور اس میں سورہ مرسلات کی تلاوت فرمائی تھی، تو مغرب کی نماز میں تطویل قراءت کو منسوخ کہنا امام طحاویؒ کی تعبیر نسخ پر ہی ممکن ہے۔ یعنی اس نماز میں لمبی قراءت کرنا جائز تو ہے لیکن مستحسن نہیں۔ اسی طرح اس اصطلاح کی ایک اور مثال نماز میں رفع الیدین کا مسئلہ ہے، امام طحاویؒ نے اسے منسوخ قرار دیا ہے حالانکہ یہ احادیث سے ثابت ہے اور بتصریح فقہاء مشروع ہے، اس لیے یہاں نسخ سے مراد یہ ہوگا کہ یہ عمل مشروع تو ہے لیکن خلاف اولی ہے۔ گویا امام طحاویؒ نے نسخ کی الگ تعبیر کی ہے اور اسے جابجا احادیث کی تعبیر میں استعمال کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

ثم إن أبا داود قال: إن تطويلَ القراءة في المغرب منسوخٌ، مع أنك قد عَلِمْتَ أن قِراءته ب: «المرسلات» كان في مرض الموت، فكيف يمكن القولُ بالنسخ إن لم يُحْمَل نسخه على ما قاله الطَّحَاويُّ، وإذا قال الطحاويُّ: إن رفعَ اليدين منسوخٌ، جَلَبُوا عليه من كل جانبٍ، مع أنه يتكلَّم ممن اختار الوُجُوبَ، ونسخُ الوُجُوب لا يُوجِبُ نسخَ الجواز، على أن النسخَ عنده ليس بمعنى رفع المشروعية، بل إذا جاء أمرٌ، ثم ثَبَتَ عنه بخلافه، يُطْلِقُ عليه النسخَ كما عَلِمْت منَّا مرارًا.[3]

پھر امام ابو داودؒ نے فرمایا ہے: مغرب کی نماز میں لمبی قراءت کرنا منسوخ ہے، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے "مرسلات" کی قراءت مرض الموت میں فرمائی تھی۔ تو اگر نسخ کو امام طحاویؒ کی اصطلاح پر محمول نہ کیا جائے تو نسخ کا قول کیسے ممکن ہے؟۔ اور جب امام طحاویؒ نے کہا کہ رفع الیدین منسوخ ہے، تو لوگ ان کی طرف ہر جانب سے لپکے، باوجودیکہ ان کے کلام کا رخ اس شخص کی طرف ہے جو رفع الیدین کے وجوب کا قائل ہے، (یہ تو ظاہر ہے کہ) وجوب کا نسخ جواز کا نسخ نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کہ نسخ ان کے ہاں حکم کی مشروعیت ختم ہو جانے کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ جب کوئی حکم آئے اور پھر اس کے خلاف کوئی حکم ثابت ہو جائے تو وہ اس پر بھی نسخ کا اطلاق کرتے ہیں جیسے کہ کئی بار آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔

اس کی ایک اور مثال شاہ صاحبؒ نے ظہر کی نماز کی تہجیر کے منسوخ ہونے کی دی ہے۔ امام طحاویؒ نے اسے بھی نسخ سے تعبیر کیا ہے حالانکہ ائمہ کرام میں سے کوئی بھی جلدی ظہر کی نماز پڑھنے کے عدم جواز کا قائل نہیں ہے۔[4] رفع الیدین کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے امام طحاویؒ کی اصطلاح کو مزید واضح کیا ہے، فرماتے ہیں:

وقد اشتهر في مُتَأَخِّرِي الحنفية القول بالنسخ، وإنما تعلَّمُوه من الشيخ ابن الهُمَام، والشيخ اختاره تَبَعًا للطَّحَاوِيِّ. وقد عَلِمْتَ أن نسخَ الطَّحَاوِيِّ أعمُّ ممَّا في الكُتُب، فإن المفضولَ بالنسبة إلى الفاضل، والأضعفَ دليلا بالنسبة إلى أقواه، كلُّه منسوخٌ عنده، كما يتضح ذلك لمن يُطَالِعُ كتابَه-[5]

متاخرین احناف میں رفع الیدین کے منسوخ ہونے کا قول مشہور ہو چکا ہے، انہوں نے یہ قول شیخ ابن الھمام سے سیکھا ہے، اور انہوں نے امام طحاویؒ کی اتباع میں یہ موقف اختیار کیا ہے، حالانکہ آپ جان چکے ہیں کہ امام طحاویؒ کے ہاں نسخ

کا مفہوم اس مفہوم سے بہت عام ہے جو کتابوں میں موجود ہے۔ پس ان کے ہاں فاضل کی نسبت مفضول عمل، قوی دلیل کے حامل حکم کے مقابلے میں کمزور دلیل والا حکم منسوخ شمار ہوتا ہے، جیسے کہ اس شخص کے لیے بالکل واضح ہے جو ان کی کتب کا مطالعہ کرتا ہے۔

نسخ کی کوئی بھی تعبیر اختیار کی جائے، احکام میں نسخ کی موجودگی پر بہر حال تمام فقہاء و محدثین کا اتفاق رہا ہے اور یہ اصول فقہ کا متفقہ اصول ہے۔ نسخ کے مختلف درجات ہیں، کچھ احکامات میں نسخ کے بارے میں احادیث میں صراحت آ گئی ہے [6] اور بعض احکامات میں فقہاء تعارض ادلہ کے وقت نسخ کو مختلف جہات سے متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تعارض ادلہ کے وقت فقہاء احناف و شوافع کے مابین اس بات پر اختلاف ہے کہ نسخ کی طرف کب رجوع کیا جائے گا۔ شاہ صاحبؒ اس اختلاف کو فیض الباری کے مقدمہ میں زیر بحث لاتے ہیں۔

تعارض ادلہ کے وقت رفع تعارض کی ترتیب

نصوص میں جب کہیں تعارض ہو جائے تو اس تعارض کو رفع کرنے کے لیے ائمہ کرام نسخ، تطبیق، ترجیح اور تساقط کو استعمال کرتے ہیں۔ ائمہ احناف اور شوافع کے مابین ان چار اصطلاحات کی ترتیب میں کچھ اختلاف ہے۔ ائمہ احناف کے ہاں سب سے پہلے نسخ، پھر ترجیح، پھر تطبیق اور اگر یہ تینوں صورتیں ممکن نا ہوں تو تساقط کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ شوافع کے ہاں سب سے پہلے تطبیق کی کوشش کی جاتی ہے، اگر تطبیق ممکن نا ہو تو نسخ کو دیکھا جاتا ہے، اگر نسخ بھی متعین نا ہو تو ترجیح سے کام لیا جاتا ہے، اگر ترجیح بھی ممکن نا ہو تو دونوں حدیثوں پر عمل کو موقوف کر دیا جاتا ہے یعنی تساقط پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس ترتیب کے بارے میں شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ بادی النظر میں شوافع کی ترتیب زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر زیادہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو احناف کی اختیار کردہ ترتیب زیادہ مناسب اور قرین قیاس نظر آتی ہے۔

اس کی دلیل کے طور پر وہ فرماتے ہیں کہ تطبیق و تساقط میں ترتیب تو بالکل واضح ہے کہ دونوں احادیث یا نصوص کو ناقابل عمل قرار دینے سے پہلے کوئی ایسی تعبیر اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جس کی وجہ سے دونوں احادیث عمل میں آ جائیں۔ جب تطبیق ممکن نا ہو تو پھر تساقط کی طرف جایا جائے۔ اسی طرح ترجیح کو تطبیق سے مقدم رکھنا بھی بالکل واضح ہے۔ کیونکہ انسان کی جبلت و فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اقوی دلیل کی طرف مائل ہوتا ہے اور کمزور دلیل کے مقابلے میں اس کو خود بخود قبول کر لیتا ہے۔ جیسے کسی مسئلہ میں اگر ایک آدمی کوئی فتوی دے، پھر کوئی زیادہ قابل اعتماد آدمی اسی معاملے میں پہلے فتوی کے مقابل کوئی فتوی دے تو انسان بغیر کسی تامل کے زیادہ قابل اعتماد آدمی کی بات کو تسلیم کر لیتا ہے۔ گویا ترجیح کا درجہ تطبیق سے اوپر ہے۔ اور ترجیح و نسخ کی ترتیب میں نسخ اس لیے مقدم ہوتا ہے کہ اگر کسی جگہ نسخ کی تعیین ہو جائے تو پھر باقی کے سب درجات بے معنی ہو جاتے ہیں، اس لیے سب سے پہلے نسخ کو ہی دیکھا جائے گا، اگر نسخ متعین ہو گیا تو بہت بہتر اور اگر نسخ بہتر نہ ہوا تو پھر باقی کے تین درجات میں سے کسی ایک کو متعین کیا جائے گا۔ [7]

شاہ صاحبؒ کے ہاں نسخ

شاہ صاحبؒ کا نسخ کے باب میں موقف یہ ہے کہ منسوخ آیات دو طرح کی ہیں۔

1۔ منسوخ الحکم 2۔ منسوخ التلاوۃ

ان کی تعبیرات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جن آیات کی تلاوت قرآن کریم میں باقی ہے اور اہل علم کے ہاں ان کو منسوخ الحکم شمار کیا جاتا ہے، وہ ان کے ہاں بالکلیہ منسوخ نہیں ہیں بلکہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے محکم ہیں اور ان کا حکم بھی بعض پہلوؤں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور جن آیات کی تلاوت منسوخ کر دی گئی ہے، ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے ان سب کا تتبع کیا اور ان کو فصاحت و بلاغت میں محکم آیات سے کم تر پایا، گویا ان کی تلاوت منسوخ ہونے کی ایک وجہ ان کے ہاں ان آیات کا فصاحت و بلاغت کے اس معیار پر پورا نہ اترنا ہے جو اعجاز القرآن کے لیے ضروری ہے [8]۔ خلاصہ یہ کہ ان کے ہاں حتی الامکان نصوص کی ایسی تعبیر کی جاتی ہے کہ جس سے نسخ سے احتراز ہو سکے۔ فرماتے ہیں:

> وقد مَرَّ أنَّ الآياتِ المنسوخةَ أَنْزَلُ رُتْبة في الإعجاز مِن الآياتِ المُحْكَماتِ - ثُم أنَّ ما يَزْعُمه الناسُ مَنْسُوخًا ليس بمنسوخٍ عندي، لبقاء حُكْمه في الجنس، ويكون ذلك تذكارًا لِوُرُود الحُكْم في ذلك الجنس، وإنْ رُفِع الآن عن بَعْضِ أنواعه، وعليه قراءةُ الجرّ عندي في آية المائدة: {وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ} فإنَّ المَسْحَ على الأَرْجل ثابتٌ في حال التَّخَفُّف، ولولا هذه القراءةُ لانعدمت مسألةُ المَسْح على الخُفِّ عن القرآن رأسًا، ففي تلك القراءةِ إيماءٌ إلى أنَّ الأَرْجُل قد يكون لها حَظٌّ مِن المسح أيضًا. فبقاءُ هذا الحُكْم في الجنس هو مفادُ تلك القراءةِ.-[9]
>
> اور تحقیق گزر چکا ہے کہ منسوخ آیات اعجاز میں محکم آیات کے مقابلے میں کم تر رتبہ پر ہیں۔ پھر جن آیات کو لوگ منسوخ گمان کرتے ہیں وہ میرے ہاں منسوخ نہیں ہیں، ان کے حکم کے جنس میں ثابت ہونے کی وجہ سے، اور یہ اس حکم میں حکم کے وارد ہونے کی یادگار کے طور پر ہوگا، اگرچہ اب وہ حکم اس جنس کی بعض انواع سے اٹھا لیا گیا ہے۔ (نسخ کے اسی مفہوم پر) میرے ہاں سورہ المائدہ کی آیت: ترجمہ "اور مسح کرو اپنے سروں کا اور پاوں کو دھولو" میں جر کی قراءت ہے (کہ جس سے پاوں کا مسح ثابت ہوتا ہے۔)۔ کیونکہ پاوں پر مسح موزے پہننے کی حالت میں ثابت ہے، اگر یہ قراءۃ نہ ہوتی تو موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ قرآن کریم سے سرے سے ہی منعدم ہو جاتا۔ چنانچہ اس قراءت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی کبھی پاوں کے وظیفے میں مسح کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس حکم کو جنس میں کسی نہ کسی درجے میں باقی رکھنا اس قراءت کا مفاد ہے۔

اسی اصول کی ایک اور مثال اس حدیث کی تشریح میں ملتی ہے کہ جس میں مواخات مدینہ کی وجہ سے مہاجرین و انصار میں میراث کے اجراء اور پھر اس کے منسوخ ہونے کا تذکرہ ہے۔ [10] اس حوالے سے انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت اپنی بعض جزئیات میں تو منسوخ ہے جیسے میراث میں لیکن بعض جزئیات میں ابھی بھی محکم ہے، جیسے اپنے اس بھائی کی مشکل اوقات میں مدد و حمایت کرنا اور ضرورت کے وقت خیر خواہی چاہنا اور نصیحت کرنا۔ اس مثال کے بیان کے بعد شاہ صاحبؒ اپنے اصول نسخ کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

وهذا الذي كُنْتُ أقولُ: إنه ثَبَتَ عندي بالاستقراء أنه مَا مِنْ آيةٍ إلا وهي مُحْكَمَةٌ في بعض الجزئيات، كما مرَّ تقريره في الصيام. لا أريد به بقاء ترجمته بعينها في الحكم، بل أُرِيدُ به بقاء جنس الحكم في جزئي من الجزئيات. فلا أَعْرِفُ آيةً من الآياتِ المنسوخةِ التي لا يكون لها نفعٌ أصلا، ولا أقل من أنها تبقى تِذْكَارًا لذلك الجنس.[11]

یہی بات ہے جو میں کہتا ہوں۔ میرے ہاں استقراء سے یہ بات ثابت ہے کہ کوئی (منسوخ) آیت ایسی نہیں جو بعض جزئیات میں محکم نہ ہو، جیسے کہ اس کی تقریر "الصیام" میں گزر چکی ہے۔ میری مراد حکم میں اس کے مکمل مفہوم کا باقی ہونا نہیں ہے۔ بلکہ میری مراد جنس حکم کا کسی نہ کسی جزئی میں باقی رہنا ہے۔ چنانچہ میں کوئی ایسی منسوخ آیت سے واقف نہیں ہوں کہ جس کا بالکل بھی کوئی فائدہ نہ ہو، کم از کم اتنا تو ہے کہ یہ (منسوخ حکم کی) جنس کی یادگار کے طور پر باقی ہے۔

نسخ کی بجائے انتہاء العمل پر محمول کرنا

شاہ صاحبؒ نے مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنے کے جواز و عدم جواز پر بحث کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ بہت سے اعمال رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھے لیکن بعد کے زمانوں میں ان پر عمل کم ہو گیا یا ختم ہو گیا۔ لوگوں نے اس انتہاء عمل کو نسخ پر محمول کر لیا، شاہ صاحبؒ ایسے مسائل میں "انتہاء العمل" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، انہیں بھی نسخ پر محمول نہیں کرتے۔ ان کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ حاشیہ میں مولانا بدر عالم میر ٹھیؒ ان کے اسی اصول کی وضاحت کی ہے[12] اور اس روایت کی تشریح میں خود شاہ صاحب نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں:

وما تحصَّل عندي: أنهما قد عُمِلَ بهما في زمنٍ، ثم انتهى العملُ بالترك، كما مرَّ عن ابن عمر رضي الله عنه. وعند النسائي في باب الرخصة في الصلاة قبل المغرب: «أنَّ أبا تميم الجَيْشَانِيَّ قام لِيَرْكَعَ ركعتين قبل المغرب، فقلتُ لِعُقْبَةَ بن عامرٍ: انظر إلى هذا، أيَّ صلاةٍ يُصَلِّي؟ فالتفتَ إليه فرآه، فقال: هذه صلاة كنا نُصَلِّيها على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلّم. اهـ. فَثَبَتَ منه الجزآن، أي أنها كانت في عهد النبيّ صلى الله عليه وسلّم ثم انقطع بهما العمل حتى أفضى إلى الإنكار عليهما. أَلا ترى إلى قوله: «أيَّ صلاةٍ يُصَلِّي؟» كيف يَتَسَاءلُ عنها كأنه لا يَعْرِفُ أصلها.[13]

میرے ہاں جو بات واضح ہے وہ یہ کہ ان دو رکعات کے پڑھے جانے پر ایک زمانے میں عمل ہوتا تھا، پھر یہ عمل ان کو چھوڑنے پر منتہی ہوا، جیسے کہ حضرت ابن عمرؓ کے حوالے سے گزر چکا۔ اور امام نسائیؒ کے ہاں "مغرب سے پہلے نماز میں رخصت کے باب میں" ہے کہ "ابو تمیم جیشانی مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے، میں نے عقبہ بن عامر کو کہا: اس کو دیکھو، یہ کون سی نماز پڑھ رہے ہیں؟ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو دیکھ کر کہا: "یہ نماز ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں پڑھا کرتے تھے"۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوئی: یہ دو رکعتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھیں، پھر ان پر عمل منقطع ہو گیا یہاں تک کہ معاملہ ان پر انکار تک پہنچ گیا۔ کیا آپ ان کے اس قول کو نہیں دیکھتے "یہ کون سی نماز پڑھ رہے ہیں"۔ کیسے وہ اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ جیسے اسے جانتے ہیں نہیں۔

نسخ کی بجائے استحباب للخواص پر محمول کرنا

بہت سے مسائل میں کہ جہاں فقہاء کا نسخ پر اتفاق ہو چکا ہے ، شاہ صاحبؒ ان مسائل میں بھی بالکلیہ نسخ کے قائل نہیں ہیں اور ان مسائل کی ایسی تعبیر و تشریح کرتے ہیں کہ نسخ کی بجائے ان کی افادیت واضح ہو جاتی ہے،ان مسائل میں آگ پر پکی ہوئی چیز کے استعمال سے وضوء ، شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضوء ، مباشرت کے بعد بغیر وضوء کے سونے کی ممانعت اور عورت کو چھونے اور اونٹ کا گوشت استعمال کرنے سے وضوء وغیرہ شامل ہیں۔شاہ صاحب نے ان کو نسخ پر محمول کرنے کی بجائے "استحباب للخواص" پر محمول کیا ہے،ان کی عبارات کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی جتنی بھی روایات ہیں ان میں شارع نے خواص کو ہدایات دی ہیں ، ان کے بارے میں جب روایات میں ذکر موجود ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ شارع کی نظر میں یہ سب مطلوب ہیں ، لیکن کیونکہ اس بارے روایات سے نسخ کی طرف اشارہ ہوتا ہے اس لیے ان کا مطلوب ہونا عام فقہی مسائل کی طرح نہیں ہے ، اسی لیے یہ فقہاء کا میدان نہیں رہا۔شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ میں انہیں خواص کے لیے مستحب سے تعبیر کرتا ہوں کیونکہ بہت سی وہ باتیں جن پر عام لوگوں سے عمل مطلوب نہیں ہوتا، خواص ان پر بھی عمل کرتے ہیں۔شاہ صاحبؒ پہلے ان روایات میں اپنے اصول نسخ کے مطابق نسخ کی نفی کرتے ہیں اور پھر ان احادیث کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جس سے نسخ کا احتمال نہ رہے، اس کے بعد انہیں "استحباب للخواص" پر محمول کرتے ہوئے عمل کا محل اور توجیہ بیان کرتے ہیں۔جس چیز کو آگ نے چھولیا ہو اس کے استعمال کے بعد وضوء کے مسئلہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرکے فرماتے ہیں :

قلت: لم يُرِد به جابر رضي الله عنه بيانَ النَّسخ، إِنَّما أشار إلى ما وقع من النبي صلى الله عليه وسلّم الوُضُوء، وتَرْكه في يوم واحدٍ، حيث قال: «قَرَّبْتُ للنبي صلى الله عليه وسلّم خبزًا ولحمًا، فأكل، ثم دعا بوَضُوء فتوضَّأ به - فهذا هو الأمر الأول - ثم صلَّى الظُّهر، ثم دعا بفَضْل طعامه فأكل، ثم قام إلى الصَّلاة ولم يتوضَّأ» - وهو الأمر الآخر - فبيَّن جابر رضي الله عنه أنه توضَّأ منه، ولم يتوضَّأ أيضًا، والذي كان منهما آخرًا هو عدم الوضوء، وإليه أشار أبو داود حيث قال بعد نقل حديث جابر الأول: «كان آخر الأمْرَين ... » إلخ، قال أبو داود: هذا اختصار من الحديث الأول، فإِذن لا يريد بيان النسخ، أي أن الوُضُوء منه كان، ثم تُرِك، فكان آخر الأَمْرَين بهذا الطريق، بل أراد من الأَمْرَين الواقعتين كما ذكرهما هو قبله، ولا يَكْفِي للنسخ مجرد كونه آخرًا، لأن ما يكون مُسْتَحَبًّا يَرِد فيه الفعل وتركه لا محالة، فلو كان ترك الوُضُوء آخرًا بهذا الطريق، لَمَا كان فيه دليلًا على النسخ أصلًا.[14]

میں کہتا ہوں : اس حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مراد بیان نسخ ہے ہی نہیں ، انہوں نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس میں رسول اللہ ﷺ نے وضوء کیا بھی اور چھوڑا بھی۔انہوں نے کہا : "میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے روٹی اور گوشت پیش کیا،آپ ﷺ نے تناول فرمایا، پھر آپ ﷺ نے وضوء کا پانی منگوایا اور وضوء کیا۔یہ واقعہ کا پہلا حصہ ہے۔پھر آپ ﷺ نے ظہر کی نماز ادا کی ، پھر بقیہ کھانا منگوایا اور تناول فرمایا، پھر آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور وضوء نہیں فرمایا" ۔یہ اس واقعہ کا دوسرا حصہ ہے۔ سو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا وضوء کرنا بھی بیان کیا ہے اور نہ کرنا بھی۔اور ان دونوں میں سے جو آخری عمل ہے وہ عدم وضوء ہے، اور

اسی کی طرف امام ابوداود نے اشارہ کیا ہے کہ جب حضرت جابر کی پہلی حدیث نقل کرنے کے بعد کہا: "یہ پہلی حدیث کا اختصار ہے"۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کا ارادہ نسخ کا بیان نہیں تھا، یعنی یہ کہ اس عمل سے پہلے وضوء کرنا ضروری تھا لیکن پھر چھوڑ دیا گیا اور یہ آخرالامرین اس (نسخ کی) وجہ سے ہے۔ بلکہ ان کا ارادہ دو واقعاتی امور کو بیان کرنا تھا جیسے کہ انہوں نے پہلے ذکر کیا۔ اور نسخ کے لیے اس کو محض آخر میں ہونا کافی نہیں۔ کیونکہ جو کام مستحب ہوگا لامحالہ اس کا فعل اور ترک دونوں ہی ہوں گے۔ چنانچہ اگر وضوء کا ترک اس طریق پر آخری الامرین ہے تو اس میں نسخ کی سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔

اس کے بعد انہوں نے شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے یہ ذکر کیا ہے کہ آگ سے متغیر چیز کے استعمال سے وضوء کرنا مستحب ہے۔ مستحب کی تفصیل کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں مستحب سے شاہ ولی اللہؒ کی مراد مستحب الخواص ہے، گویا مستحب کی دو قسمیں ہو گئی۔ ایک وہ جو صورت کی وجہ سے مستحب ہے، اس مستحب کی تعیین فقہاء کرتے ہیں اور دوسرا وہ مستحب جو معنی کی وجہ سے مستحب ہو۔ اس کی تعیین فقہاء نہیں کیا کرتے بلکہ یہ مستحب الخواص ہے اور خواص ان پر ان فوائد کے حصول کے لیے عمل کرتے ہیں جن کی طرف یہ احادیث اشارہ کرتی ہیں۔ اس جیسے جتنے بھی امور احادیث میں مذکور ہیں کہ جن کے بارے میں فقہاء و محدثین کی رائے نسخ کی ہوتی ہے، شاہ صاحبؒ ان کو "مستحب الخواص" میں شمار کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

واختار الشَّاه ولي الله رحمه الله تعالى: أنه مُسْتَحبٌّ، وأزيد عليه شيئًا، فأقول: إنه مُسْتَحَبُّ الخَوَاصِّ دون العَوَامّ، ومُسْتَحَبُّ الخَوَاصِّ هو ما يكون مُسْتَحَبًّا لأجل المعنى. فالمُسْتَحَبٌّ على نحوين: مُسْتَحَبٌّ لأجل الصورة، وهو الذي وَرَدَ الشرع باستحبابه، وهو الدائر في الفقه، ومُسْتَحَبٌّ لأجل المعنى، وهو ما يكون فيه إيماءٌ إلى الفائدة فيه، ولم يَرِدِ الشرع باستحبابه صراحةً. ولمَّا أومأ إلى فوائد فيه، عَلِمنا أنَّه مطلوبٌ، فقلنا: إنه مُسْتَحَبٌّ لأجل المعنى الموجب للاستحباب، وإن لم يكن من جهة الصورة. وليس هذا النوع من وظيفة الفقهاء، وأَسَمِّيْه مُسْتَحَبَّ خَوَاصِّ الأمة، كالوضوء للجُنُب، فإنه أشار الشرع إلى معنى فيه، لما في «معجم الطبراني» في جُنُبٍ ينام ويموت: «إن الملائكة لا تَحْضُر جِنَازته». وبالوُضُوء تَنْدَفع هذه المَضَرَّة، فهذا المعنى أوجب القول باستحبابه.[15]

امام شاہ ولی اللہؒ نے اس (آگ سے پکی چیز کے استعمال سے وضوء) کو مستحب کہا ہے۔ میں اس پر ایک چیز زیادہ کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہ مستحب الخواص ہے، نہ کہ عوام کے لے مستحب۔ اور مستحب الخواص وہ امر ہے جو کسی معنا مستحب ہو۔ چنانچہ مستحب دو قسم کا ہوا۔ وہ جس کے استحباب پر شرع وارد ہو، یہی فقہ کے دائرے میں آتا ہے۔ اور معنی مستحب، وہ جس میں کسی فائدہ کی طرف اشارہ ہو اور اس کے استحباب پر صراحۃ شرع کا ورود نہ ہوا ہو۔ جب اس میں فوائد کی طرف شرع نے اشارہ کیا تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ ایک مطلوب امر ہے۔ اس لیے ہم نے کہا کہ یہ کسی ایسے معنی کی وجہ سے مستحب ہے جو استحباب کو واجب کرتا ہے، اگرچہ یہ صورۃ مستحب نہیں ہے۔ استحباب کی یہ نوع فقہاء کا وظیفہ نہیں ہے، میں نے اسے "امت کے خواص کا مستحب" کا عنوان دیا ہے، جیسے جنبی کا وضوء کرنا۔ اس میں شرح نے ایک زائد فائدہ یا معنی کی طرف اشارہ کیا، جیسا کہ "معجم طبرانی" ایسے جنبی کے بارے میں جو سوئے اور فوت ہو جائے، کے بارے

میں وارد ہوا ہے کہ "بے شک فرشتے اس کے جنازے میں نہیں آتے"۔ اور وضوء کے ذریعہ یہ نقصان دور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ معنی یا فائدہ اس کے استحباب کے قول کو واجب کرتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اسی ضمن میں شرمگاہ کو چھونے، عورت کو ہاتھ لگانے اور اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضوء کرنے کو بھی شمار کیا ہے اور اس وضوء کو خواص کے لیے مستحب شمار کیا ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر انہوں نے ایک جزئیہ یہ بیان کیا ہے کہ ہمارے فقہاء نے اجنبی خاتون کی طرف دیکھنے اور غیبت کے بعد وضوء کا وجوب بتایا ہے تو شرمگاہ کو چھونا یا عورت کو ہاتھ لگانے کے بعد وضوء کیوں نہیں ہوگا حالانکہ یہ دونوں پہلے دونوں کاموں سے زیادہ فحش اور سخت ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ کے مزاج سے استدلال کرتے ہوئے ان سب امور کے استحباب کو ثابت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کھانے اور پینے میں ایسی چیز کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ جس میں انسانی فعل کا عمل دخل کم سے کم ہو فرماتے ہیں، جیسے کہ آپ ﷺ تازہ پھل پسند فرماتے، بارش کے پانی کو بہت مرغوب رکھتے اور اس بارے میں فرماتے کہ یہ زمینی پانی کی نسبت رب کریم سے زیادہ قربت رکھتا ہے، لیکن جب یہی پانی زمین میں جمع ہو جاتا یا پھل یا کھانے کے ساتھ انسانی عمل منسلک ہو جاتا تو پھر پسندیدگی کا وہ معیار برقرار نہ رہتا کہ جو پہلے تھا، گویا یہ چیزیں یک گونہ آلودہ ہو گئیں، اسی آلودگی کو دور کرنے کے لیے شارع نے ان کے استعمال کے بعد وضوء کا حکم دیا، شاہ صاحبؒ اس کو یوں تعبیر کرتے ہیں:

فإنَّ الملائكة لهم تُبَاعِد وتُنَافِر عن الأكل والشرب بطباعهم الزكية، ومن أكل أو شرب المطبوخ الذي تَدَنَّسٍ بصنعهم ونَضَّجَتْهُ أيديهم، فكأنه وقع على بُعْدٍ بعيد من طَبْعهم، فلعلّ الشرع أمر بالوُضُوء منه تلافيًا لهذا البُعْدِ، أمّا اليانع على الشجرد فإنه بمَعْزِلٍ عن النظر، لأنه حديث عَهْدٍ بربه، وبركة من الله. وكان النبي صلى الله عليه وسلّم يضع البَاكُورَة على عينيه، ويعطيه أصغر الولدان، وأمّا المطبوخ، فقد مَسَّته النار، ولَحِقَتْهُ صَنْعَة، البشر، وغيرّته عمّا نزل إليهم، فمَحَقَت بركته، وبدَّلت قُرْب عهده بالبُعْد، ودَنَّسَتْهُ بأدناس البشر، فشأنه لا يكون شأن الثمر، فإنه قد عُلِمَ من شأنه صلى الله عليه وسلّم أنه كان يَتَبَادر إلى ماء المطر، ويقوم فيه قائلًا: «إنه حديثُ عهدٍ بربهٍ». ولم يكن يفعل مثله بسائر المياه، لأن هذا الماء بعد استقراره في حفرة أو بِرْكة تلطَّخ بأنواع الأدناس، ولن يبقَ على صفة حَدَاثة العهد. فالحاصل: أن الوضوء من هذه الأشياء ليس كالوضوء من الأحداث والأنجاس، بل من باب التشبُّه بالملائكة والتقرُّب إليهم.[16]

عمل سے پہلے نسخ کا حکم

نسخ کے باب میں ایک بحث یہ ہوتی ہے کہ کیا عمل سے پہلے نسخ جائز ہے؟ بعض لوگ اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک بڑی جماعت اسے ناجائز مانتی ہے۔ ان پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ اگر عمل سے پہلے نسخ آپ کے ہاں جائز نہیں تو معراج کی رات جب پچاس نمازیں فرض ہوئیں اور عمل کرنے سے پہلے ہی پانچ کر دی گئیں، تو کیا یہ عمل سے پہلے نسخ نہیں ہوتا؟ اس کے جواب میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اصل میں مامور بہ اس منسوخ شدہ عمل کی فرضیت پر اعتقاد رکھنا تھا۔ عمل ضروری نہیں تھا۔ جب حضور اکرم ﷺ کی طرف سے یہ اعتقاد پایا گیا کہ یہ سب نمازیں حق ہیں تو نیابتاً آپ ﷺ کی پوری امت کی طرف سے بھی یہ اعتقاد کا فریضہ ادا ہو گیا۔ اس لیے یہاں پر نسخ قبل العمل نہیں ہوا بلکہ بعد العمل ہی ہوا۔[17]

شاہ صاحبؒ کی اس مسئلہ میں رائے یہ ہے کہ یہاں پر اصلا نسخ ہوا ہی نہیں۔اس لیے اس حوالے سے کسی تفصیل میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ معراج میں نماز کی فرضیت اور پھر پچاس میں سے پانچ تک کمی کا معاملہ ایک انوکھے طریقہ سے عنایۃ و کرم کرنے کا معاملہ ہے۔ اس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے بیٹے کی میراث کا سوال کرنے والے شخص کو انوکھے انداز میں جواب مرحمت فرمایا تھا۔ کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میرا بیٹا فوت ہو گیا ہے،اس میں میراث میں سے میرا کتنا حصہ ہے؟آپ ﷺ نے اسے کہا کہ تیرے لیے چھٹا حصہ ہے،جب وہ جانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا : تیرے لیے ایک اور سدس بھی ہے۔ جب وہ تیسری مرتب جانے کے لیے پلٹا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے سہ بارہ بلا کر فرمایا کہ دوسرا سدس تیرے گزراوقات کے لئے ہے [18]۔اس روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اسے پہلی ہی مرتبہ ثلث کیوں نہیں دیا ؟اور کیا کوئی صاحب عقل اس معاملے کو نسخ کہہ سکتا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ "القاء المراد حصۃ بحصۃ" والا معاملہ ہے جس سے متکلم کا نسخ کے علاوہ کچھ اور مقصود ہوتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :

ولا نسخ عندي ، فلا سؤال و لا جواب ، بل هو القاء للمراد علي المخاطب بعد مراجعات شتي، و ابراز لمافي الضمير حصة حصة، ليكون له وقع في النفس و محل من القبول ، لان الحاصل بعد الطلب اعز من المنساق بلا تعب، فهذا من طرق التفهيم ، بل هو من نحو من العناية ا الاكرام ، و التفضل و الانعام علي سيد الانام ، وكيف و كان في النسائي : فقال : " هي خمس و هي خمسون ، لا يبدل القول لدي--" الخ ، فنبه الله سبحانه علي انه لا نسخ و انما هو من باب الحسنات بعشر امثالها ، فالخمس ههنا خمسون عند ربنا تبارك وتعالي -[19]

تعیین نسخ کے قرائن

ائمہ فقہ کے ہاں نسخ کے تعیین معلوم ہونے کے لیے کچھ دیگر اصول و قرائن بھی استعمال ہوتے ہیں،ان میں سے ایک کسی عمل کا زمانی طور پر متاخر ہونا بھی ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے پہلے ایک حکم دیا ہو اور پھر اس حکم کے خلاف عمل کیا ہو جو زمانی طور پر اس حکم سے متاخر ہے۔ایسی صورت میں متاخر عمل کو سابقہ حکم کا ناسخ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی چند امثلہ حسب ذیل ہیں۔

1۔ نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدایت کی تھی کہ

((وإذا صلى جالسا فصلوا جلوسا))[20]

کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر نماز پڑھو۔

لیکن مرض الوفات میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو اس حالت میں نماز پڑھائی کہ آپ ﷺ بیٹھ کر امامت کر رہے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم پیچھے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔[21]اس حدیث کے آخر میں امام بخاریؒ نے امام حمیدیؒ کا ایک قول نقل کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ اس باب میں یہی آخری عمل ہی پر اب عمل ہوگا، گویا اس فعل نے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا [22]۔ شاہ صاحبؒ اس مسئلہ کی تشریح میں یہ رائے اختیار کی ہے کہ جب آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو یہ کہا تھا کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو تو اس کی اقتداء بھی بیٹھ کر ہی کرو، تو یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ گھوڑے سے گرنے کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی رخصت پر

عمل کر رہے تھے، کچھ صحابہ کرام نے اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرنا چاہی، حالانکہ وہ یہی نماز صحیح امام کی اقتداء میں پڑھ سکتے تھے، توآپ ﷺ نے صحیح امام کی اقتداء کی قدرت کے باوجود معذور امام کی اقتداء پر اصرار کے اس رویے پر تنبیہ کے لیے یہ فرمایا کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھا کرو، انہوں نے اس فعل کو اعاجم کے فعل سے تشبیہ دی ہے کہ جو اپنے بڑے لوگوں کے لیے کھڑے رہا کرتے تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے یہ بات پسند نہیں کی کہ وہ بیٹھے رہیں اور صحابہ کھڑے رہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ یہاں سے کوئی کلی حکم بیان کرنا مقصود ہی نہیں تھا، اصل عمل وہی ہے جو مرض الوفات میں رسول اللہ ﷺ نے کیا، کیونکہ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے مذکورہ بالا اصرار نہیں پایا گیا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے ان کو بیٹھنے کا نہیں کہا۔ شاہ صاحبؒ نے یہ تعبیر امام احمدؒ کے ایک قول کی توجیہ بیان کرنے کے لیے کی ہے کہ جس میں انہوں نے اس امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو حرام قرار دیا ہے جو خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو۔[23] اس کے بعد نسخ والے قول کو بھی درست قرار دیا ہے۔[24] لیکن پھر اپنے اصول نسخ کے مطابق اسی واقعہ کی ایک اور توجیہ بھی بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ پہلا واقعہ نفل نماز کا ہو جس میں قیام بھی جائز ہوتا ہے اور بلا عذر بیٹھ کر نماز ادا کرنا بھی، رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ تم اپنی امامت کے لیے تندرست امام ہی تلاش کرو، لیکن اگر تم یہاں نماز پڑھنے پر اصرار کر رہے ہو تو مقتدی و امام کے مابین صورۃ مناسبت پیدا کرنے کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھ لو، اور تمہاری نماز نفل ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج بھی نہیں، اس لیے بیٹھ جاؤ۔ یہ نماز نفل نماز تھی، اس کی تائید کے طور پر شاہ صاحبؒ نے یہ کہا ہے کہ ہو سکتا ہے صحابہ مسجد نبوی میں فرض نماز پڑھ کر ہی آئے ہوں اور یہاں رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتا دیکھ کر برکت کے لیے اس میں بھی شریک ہو گئے ہوں۔

> وكنت أزعم يمكن الجواب بأن واقعة الباب لعل واقعة النافلة، وفي النافلة يجوز القيام والقعود، وإذا كان الأمران جائزين في النافلة فالمرغوب القعود لأن فيه تشاكل الإمام والمقتدي،---إن المذكور فيه أن صلاته عليه الصلاة والسلام كانت مكتوبة لا إن كانت صلاتهم أيضاً كذا بل لعلهم كانوا متنفلين، ولعلهم صلوا أولاً في المسجد النبوي فريضة ثم أتوا عنده عليه الصلاة والسلام لعيادته-[25]

خلاصہ بحث

خلاصہ یہ کہ شاہ صاحبؒ نسخ کے باب میں ان اہل علم کی نمائندگی کرتے ہیں کہ جن کے ہاں موجودہ نصوص میں سے کوئی بھی بالکلیہ منسوخ نہیں۔ جن آیات کو منسوخ کہا جاتا ہے وہ اپنی بعض جزئیات میں تو منسوخ ہیں لیکن بہت سی جزئیات میں یہ ابھی بھی محکم ہیں۔ فرق صرف تعبیر کا ہے۔اپنے اسی نظریہ نسخ کو شاہ صاحبؒ نے احادیث کی تعبیر و تشریح میں بھی جابجا استعمال کیا ہے، یہاں تک کہ وہ احادیث جو جمہور اہل علم کے ہاں منسوخ ہیں، ان کی بھی شاہ صاحبؒ ایسی تعبیر کرتے ہیں کہ جس سے ان پر کسی نہ کسی درجہ میں عمل ممکن ہو جاتا ہے۔ گویا وہ کسی بھی آیت یا حدیث کو بالکلیہ ناقابل عمل چھوڑنے کے حق میں نہیں ہیں، الا یہ کہ نسخ قطعی و حتمی دلائل وقرائن سے متعین ہو جائے۔

References

1۔شاہ ولی اللہ،الدہلوی، أحمد بن عبد الرحیم(1703ءتا1762ء)،الفوز الكبير في أصول التفسير،(دار الصحوة–القاهرة الطبعة:الثانية-1407ھ-1986م)، ص:83تا94

1.1۔البقرة:106

2۔محمد أنور شاہ بن معظم شاہ الكشميري(المتوفى:1353ھ)،فيض الباري علي صحيح البخاري،(دار الكتب العلمية بيروت–لبنان،الطبعة:الأولى،1426ھ-2005م)،51/1

ايضا،العرف الشذي شرح سنن الترمذي،(دار التراث العربي-بيروت،لبنان،الطبعة:الأولى،1425ھ-2004م)،226/1

3۔فيض الباري على صحيح البخاري(353/2)

4۔العرف الشذي شرح سنن الترمذي(300/1)

5۔فيض الباري على صحيح البخاري(329/2)

6۔عمار خان ناصر،ڈاکٹر،"فقہ الحدیث میں احناف کا اصولی منہج"،(ناشر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ،2019ء)،ص:359-360

7۔فيض الباري على صحيح البخاري،47/1-48

8۔مولانا بدر عالم میرٹھیؒ ان آیات کے بارے میں کہتے ہیں کہ شیخؒ سے یہ اصول معلوم ہونے کے بعد میں نے ان تمام آیات کا تتبع کیا اور انہیں ایسا ہی پایا جیسا کہ شاہ صاحبؒ نے کہا تھا۔

(فَقَرَأْنَا فِيهِمْ قُرْآنًا، ثُمَّ إن ذلك رُفِعَ) قال شيخي: إن الآياتِ المنسوخةَ التلاوة أراها نازلةً في البلاغة حِذَاء المُحْكَمَاتِ. قلتُ: فتتبعتها، فوجدتها كذلك -حاشیہ فيض الباري على صحيح البخاري(51/5)

9۔فيض الباري على صحيح البخاري(195-196/5)

10۔بخاری،الجامع،کتاب الکفالۃ، باب قول اللہ عزوجل: {وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ} [النساء:33]ورقم:2292

11۔فيض الباري على صحيح البخاري(528/3)

12۔ایضا،(230/2)حاشیہ مولانا بدر عالم میرٹھی ، 13۔ایضا(230/2)، 14۔ایضا(405/1)

15۔ایضا(405/1)، 16۔ایضا(406/1) 17 ۔ایضا،49/1

18۔سنن ابي داود، كتاب الفرائض، باب ماجاء في ميراث الجد، رقم:2896،(122/3)

19۔فيض الباري على صحيح البخاري،49/1

20۔ صحيح البخاري، كتاب الاذان، باب انما جعل الامام ليؤتم به، رقم:688،(139/1)

21۔ایضا،رقم:687،(139/1) 22۔ایضا،رقم:689،(140/1)

23۔فيض الباري على صحيح البخاري(545/2)، 24۔فيض الباري على صحيح البخاري(275/2)

25۔العرف الشذي شرح سنن الترمذي(349/1)